شاعر زلف دراز

ساجدؔ جلالپوری
محلّہ جعفر آباد، پوسٹ جلالپور، ضلع امبیڈکر نگر۔224149

اس نازک موضوع پر مضمون کا آغاز اس لیے کیا کہ جب شاعر بلند پرواز کا ذکر ہو گیا تو ''شاعر زلف دراز'' کا ذکر بھی ضروری ہے۔ان کے حسن و جمال، فکر و خیال کے ساتھ لمبے بال کا بھی ذکر ہو جائے۔ یہی تو دراصل ان کی کشش و جاذبیت اور شخصیت میں چار چاند لگانے کا باعث ہیں۔نظموں، غزلوں کی بلند و بالا عمارت زلفوں کے خیالات سے ہی تعمیر ہوتی ہے۔شاعر شجر سایہ دار کے بجائے زلف گہر بار تلے ہی تھکے ماندے پناہ لیتے ہیں۔ان کا خیالستان مشک و عنبر کی جگہ زلفوں سے معطر ہوتا ہے۔ اب آپ سوچ سکتے ہیں کہ ان کی اپنی زلفوں کی کیا اہمیت ہوگی۔ ویسے آپ مطمئن رہیں ہم بال کی کھال نہیں نکالیں گے۔ کیونکہ ہم قصاب ادب نہیں ہیں۔

اردو شاعر عالم باعمل اور مشرق پرست ہوتے ہیں۔مغرب کی مردانہ کٹ زلفیں پسند نہیں۔اب اگر یہ صنف نازک کی لمبی زلفوں کی تعریف و توصیف کرتے ہیں تو خود اپنی زلفوں کو بڑھا کر اپنے اوپر بھی یہ حکم نافذ کرتے ہیں۔زلف، گیسو، کاکل، خط سے اردو ادب بھرا ہوا ہے۔

ظاہری بات ہے شریعت شاعری میں اس کے منڈانے، بڑھانے، ترشوانے یا طول و عرض کا اختلافی مسئلہ تو ہے نہیں۔اس لیے موقع ملتے ہی اتنا طول دیتے ہیں کہ ان کی زلف و ریش کو دیکھ کر خانقاہ ادب کا درویش کہہ سکتے ہیں۔ پھر اگر یہ بالوں کی لمبائی، چوڑائی بڑھائیں تو اس میں نقصان کیا ہے؟ حجامت سے بے نیاز گیسوئے طولانی سے گھر کا بجٹ طولانی نہیں ہوگا۔زلف دراز سے خرچ مہنگائی کی فضا میں پرواز نہیں کرے گا۔

زلفوں کو طویل کرنے کی ایک وجہ ناقدین یہ بتاتے ہیں کہ اکثر شاعروں کے بیوی یا محبوبہ سے جب تعلقات خراب ہو جاتے ہیں یا وہ روٹھ جاتی ہیں تو یہ عہد و پیمان کے ساتھ منّت مان لیتے ہیں کہ جب ان کے ہجر میں راتیں نہیں کٹتیں تو زلفیں کیوں کٹیں۔لہٰذا شب فراق کی لمبی کالی راتوں کی مانند زلفیں بے حد طویل ہو جاتی ہیں۔آخر محبوبہ کا کچھ عکس تو جسم پر ابھرنا چاہئے۔عشق کا نزلہ کہیں نہ کہیں گرنا چاہئے۔گالوں پر نہ سہی بالوں پر ہی سہی۔

جب ان کے سوگ اور عشق کے روگ میں زلفیں صنف نازک کے برابر ہو جاتی ہیں۔روٹھے ہوئے کافی عرصہ گزر جاتا ہے تو انہیں منانے کی کوشش بھی تیز ہو جاتی ہے کیونکہ انہیں منانے کا ہنر بھی خوب آتا ہے۔اب ان کے نزدیک جا کر انشاؔ کا شعر نرم لہجے میں پڑھتے ہیں:

گر نازنین کہے سے برا مانتے ہو تم
میری طرف تو دیکھئے میں نازنین سہی

اب وہ لجاتی، شرماتی، مسکراتی ہوئی مان جاتی ہیں۔

بعض اساتذہ زلف دراز کو شاعری کا پہلا زینہ تسلیم کرتے ہیں۔ منقول ہے کہ ایک نو زائیدہ شاعر ایک استاد کے دربار میں حاضر ہوئے تو انھوں نے فرمایا۔اس صحرائے لق و دق کے پہلے ورق پر پہلا سبق یہ درج ہے کہ پہلے اپنی زلفیں بڑھا کر کسی دوشیزہ سے عشق لڑاؤ پھر اس راستے پر آؤ۔

ہمارے بعض گیسو دراز شاعر عہد جدید کے تقاضے پر ماڈرن تعلیم سے آراستہ ہونے مغربی ممالک برطانیہ، امریکہ گئے تو وہاں کسی گوری کی سنہری زلفوں میں ایسا الجھے کہ وہیں کے ہو کر رہ گئے اور وطن عزیز کی دوشیزاؤں کو بھول گئے تو انہیں واپس بلانے کے لیے حضرت جوشؔ ملیح آبادی کو خاص طور پر کہنا پڑا:

عاشق مغرب! نگاہ شرق کے جادو بھی دیکھ
اے سنہری زلف کے قیدی سیہ گیسو بھی دیکھ

ویسے ہمارے محترم شعرا بھی دماغی و جسمانی اعتبار سے کم خوبصورت نہیں۔اس لیے ان کی زلفوں کے پیچ و خم میں وہ خود ہی گرفتار ہو جاتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی کبھی یہ خود گرفتار ہو جائیں۔

شاعروں کو زلف، گیسو، کاکل سے اتنا عشق ہے کہ ہر وقت دماغ اسی میں الجھا رہتا ہے۔لہٰذا نئے نئے مضامین، تشبیہات، استعارے، ترکیبیں، خیالات اس گھونسلے اور آشیانے میں تلاش و ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ایک ایک حرکت پر گہری نظر رکھتے ہیں۔اب یہ شاعروں کے علاوہ کس کا دماغ سوچ سکتا ہے۔

نہا کے افشاں چنو جبیں پر نچوڑو زلفوں کو بعد اس کے
دکھاؤ عاشق کو اس ہنر سے فلک پر بجلی زمیں پہ باراں

یہ خدائی اور سائنسی کارنامے زلفوں سے بارش اور افشاں سے بجلی کی ایجاد کون کرسکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہماری حکومت اگر شاعروں کی اس تکنیک سے استفادہ کرلے تو ہمارے ملک سے بجلی تخفیف اور قحط کا مسئلہ ہی حل ہو جائے۔ ہم بجلی پانی کے معاملے میں نہ صرف خود کفیل ہو جائیں بلکہ پڑوسی ممالک کو فائدہ پہنچا کر تعلقات استوار کر کے جنگ کی راہ پر خار کو گلزار کر سکتے ہیں اور اپنے شاعروں کو رائلٹی سے مالدار کر سکتے ہیں۔

ہمارے شاعروں نے دن رات زلفوں کے تاروں میں الجھنے کے باعث اتنی تحقیقات کر ڈالیں، اتنی قسمیں، شکلیں اسٹائلیں، دریافت کر لیں کہ عام آدمی اس میں الجھ کر رہ جائے۔ مثلاً

کالی زلف، سفید زلف، ریشمی زلف، سنہری زلف، نقرئی زلف، حنائی زلف، خضائی زلف، اخضری زلف، اصفری زلف، عنبری زلف، خنجری زلف، گلابی زلف، گھنیری زلف، گھنگھرالی زلف، سندوری زلف، زنجیری زلف، گوندھی زلف، سوندھی زلف، بندھی زلف، کھلی زلف، الجھی زلف، سلجھی زلف، مہکتی زلف، لہکتی زلف، لچکتی زلف، سلگتی زلف، آرائشی زلف، زیبائشی زلف، عربی زلف، عجمی زلف، صحرائی زلف، ولایتی زلف، شہری زلف، دیہاتی زلف، مثالی زلف، خیالی زلف، نکھری زلف، بکھری زلف، لمبی زلف، چھوٹی زلف، اصلی زلف، نقلی زلف، لیلائی زلف، مجنونی زلف، خاندانی زلف، انسانی زلف، شیطانی زلف، حورانی زلف، غلمانی زلف، درویشی زلف، خانقاہی زلف، درگاہی زلف، سادھوی زلف، شبنمی زلف، بادلی زلف، پریشاں زلف، پیچاں زلف، بے جاں زلف، مردانہ زلف، زنانہ زلف، افعی زلف، مقناطیسی زلف، بے ترتیب زلف، باترتیب زلف، سنواری زلف، بگڑی زلف، شاہی زلف، عروسی زلف، رنگین زلف، سادی زلف، روکھی زلف، سوکھی زلف، لہراتی زلف، بل کھاتی زلف وغیرہ

خیر ہم کوئی ''ہیئر اسٹائلسٹ'' بیوٹیشین یا ماہر جمالیات نہیں جو آپ کو انواع واقسام گناتے رہیں۔

شاعروں کی یہی زلفیں جب طول وعرض بڑھا کر دوش پر آ جائیں تو اسے ''کاکل'' کہتے ہیں۔ خوبصورت کاکل کو دیکھ کر بعض شاعر بیاکل (بے چین) ہو کر اس کا تقابل ''کابل و بابل'' کی صنف نازک سے کرنے لگتے ہیں۔

ایک شاعر کا کہنا ہے کہ ان کے غسل دریائی (ارتماسی) کا منظر اتنا پرکشش ہوتا ہے کہ پس پشت نظارہ کرتے وقت اچانک کسی جوان حسینہ کا مسحور کن تصور بیدار ہوتا ہے۔ ایسے مواقع بہت نادر و نایاب ہوتے ہیں جب یہ غسل سے فراغت کے بعد بھیگی زلفوں کو جھٹکتے ہیں تو لگتا ہے کہ کالی گھٹا ٹوٹ کے برس گئی۔ عام شاعر اس کا صحیح انداز سے تصور نہیں کر سکتے۔ آرزو لکھنوی مرحوم نے ایسے ہی کسی شاعر کے دریا میں نہانے کا منظر دیکھ کر ہی فرمایا ہوگا:

کس نے بھیگی ہوئی زلفوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کے آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

شاعروں کی زلفیں لمبی ہوں گی تو ان کی آرائش وزیبائش میں بھی اچھا خاصا وقت لگے گا۔ کوئی بھی خوبصورت چیز بنانے میں فرصت کے لمحات صَرف ہوتے ہیں۔ آئینے کے سامنے گھنٹوں زلفیں سنوارنے کا اگر دیدار ہو جائے تو جی چاہے کہ اس پر جان بھی نثار ہو جائے۔ دل صدا دے گا کہ زلف دراز کی آرائش کا سلسلہ قیامت تک دراز رہے۔ غالباً میر حسن مرحوم نے ایسے ہی کسی موقع پر کہا ہوگا:

وہ جب تک کہ زلفیں سنوارا کیا
کھڑا اس پہ میں جان وارا کیا

ماں باپ، بھائی بہن، دادا دادی، نانا نانی، خالہ خالو، پھوپھا پھوپھی وغیرہ تمام رشتوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن ہمشیرہ کو چھوڑ کر کوئی رشتہ جسم کے کسی عضو یا حصے سے منسوب نہیں ہوا۔ یہ شرف شاعروں کے توسط سے صرف زلفوں کو ہی ملا کہ جب دو لوگ ایک ہی گھر میں دو زلف گرہ گیر کے اسیر ہو جاتے ہیں تو ''ہم زلف'' بن جاتے ہیں۔

اس کی وجہ تسمیہ کے لیے کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ دو عظیم المرتبت زلف دراز شاعر آپس میں جگری دوست تھے (دیکھئے جگری لفظ سے آپ مغالطے میں نہ پڑیں ''روئے سخن جگر کی طرف ہو تو روسیاہ'') ایک ہی گھر کی دو ہمشیرہ کی زلفوں پر یوں فریفتہ وشیفتہ ہوئے کہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ دونوں نے ایک ایک بہن کی زلف کو زندگی بھر کے لیے پکڑ لیا۔ تب سے اردو میں انھیں ''ہم زلف'' کہا جانے لگا۔ یہ شاعروں کی دین ہے۔ تحقیق ہے ورنہ آج تک سوالیہ نشان لگا ہوتا کہ ''یہ رشتہ کیا کہلاتا ہے؟'' یہی ہے زلف دراز کا کمال۔

دنیا میں ایسے ایسے گیسو دراز لوگ ملتے ہیں کہ ایک نظر ڈالتے ہی آپ انھیں عظیم شاعر وادیب، فلسفی، دانشمند تسلیم کر لیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شخصیت سازی و بیت بازی میں زلفوں کا اہم کردار ہے اور یہ صحیح ہے کہ کچھ نہ کچھ ''ٹریڈ مارک'' تو ہونا چاہئے۔ یہی تو قدیم زمانے میں ان کی خاص پہچان ہوا کرتی تھی۔ ان کے قد وقامت، چال ڈھال، ناز وانداز ان کے گرد سیدھے سادے عوام کا جذبات سے بھرپور ہجوم جس سے ہم دور سے ہی تاڑ لیا کرتے تھے کہ یہ کوئی شاعر صاحب ہیں۔ یہ کوئی نئی بات تھوڑی ہے۔ ہماری زبان کے اولین صوفی شاعر وادیب ''خواجہ بندہ نواز گیسو دراز'' جنھوں نے ''معراج العاشقین'' کتاب لکھی۔ ان کے لقب سے ظاہر ہے

کہ ان کے گیسوئے مبارک دراز تھے۔ یہ کوئی عیب نہیں حُسن ہے۔

ہم نے ایک صاحب سے ان کی لمبی زلفوں کا راز دریافت کیا تو پرتپاک بولے ''جو شاعر ہو تو پھر شاعر نظر آنا ضروری ہے''۔ اب ایسا نہیں کہ یہی خالص بال ہی آپ کی شاعری کی مکمل پہچان ہے۔ فارغ البال، کم بال، بغیر بال، سفید بال سے بھی تعارف ہوسکتا ہے۔ اس یوریائی، کیمیائی دور میں جہاں مرغیاں، سبزیاں، فصلیں بلکہ نسلیں تک وقت کے پہلے پروان چڑھ رہی ہیں تو اگر ''فکر معاش، عشق بتاں، یادِ رفتگاں'' کے چکر میں عام انسان یا شاعر قبل از وقت فارغ البال یا سفید بال ہو جائے تو کوئی عجیب بات نہیں، لیکن شاعر تو شاعر ہیں۔ ہر مقام سے گوشہ اور نکتہ نکال لیتے ہیں۔ ایک شاعر اسے فن کی پختگی، عمر کی تجربہ کاری، مدتوں دشت ادب کی سیّاحی بتا کر اپنے جونیئر شاعروں پر رعب جھاڑتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ یہ موئے مقدس یوں ہی نہیں سیاہ سے سفید ہوئے ہیں۔ کتنی راتیں، باراتیں، ملاقاتیں فکرِ سخن کی نذر ہوگئیں۔ تو ایک نومشق شاعر نے شبیہ احسن کاظمی کا شعر پڑھتے ہوئے کہا۔ حضور گستاخی معاف ہو:

بالوں کا یہ اجلا پن دھوپ کی پیداوار نہ ہو
نابالغ سوچوں کا مالک بوڑھا بھی ہوسکتا ہے

نتیجہ یہ کہ ان کی ساری فنکاری، عمر کی تجربہ کاری، زلف درازی مع پختگی دھری کی دھری رہ گئی۔

چونکہ شاعر قدیم تہذیب کے پاسدار و علم بردار ہوتے ہیں۔ اس وراثت کو کیسے چھوڑیں۔ حجری عہد کے طرز آبائی و زلف صحرائی سے ناطہ کیسے توڑیں۔ ایک خادم اردو کا اس روایت کو زندہ و درخشندہ رکھنے کے لیے بالوں کا بڑھانا، سجانا، سنوارنا لازم ہے۔ اب دوسری قوموں کو تکلیف کیوں ہو۔ پھر بال پر علامہ اقبالؔ نے فرمایا کہ ''گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے'' تب سے اور شدت سے احساس ہوا کہ اردو کے گیسو میں کنگھی کرنے کے ساتھ اپنے بالوں میں بھی کنگھی کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

اتنی دلیلوں کے بعد آپ خود اپنے ذہن سے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے شاعروں کے نزدیک زلفوں کی کتنی اہمیت ہے۔ اس لیے اس کے جال سے نکلنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا شیر کے دانتوں سے ہرن کا یا شاہین کے پنجوں سے کبوتر کا۔ جو شاطر و ماہر شاعر اس جال سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو بڑے فخر سے کہتے ہیں:

دام خیال زلف بتاں سے چھڑا لیا
ہے شکر بال بال خدا نے بچا لیا

شاعر صرف زمانے کو چلاتے ہی نہیں زمانے کے ساتھ چلتے بھی ہیں۔ اس لیے عہد بہ عہد ان کی وضع قطع میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ جب ماڈرن شاعر شیروانی ٹوپی کو ترک کر کے پینٹ شرٹ، جنس ٹی شرٹ میں ''اسمارٹ'' ہونے لگے تو ان کے گیسو بھی لانگ کی جگہ ''شارٹ'' ہونے لگے۔ بعض شاعروں نے ضدی پن یا اپنی انفرادی شخصیت کے لیے لمبے بالوں کو ترک نہیں کیا اور الجھے بالوں سے زندگی کے مسائل سلجھانے لگے، لیکن ان کو نقصان اٹھانا پڑا۔

اس بات کا ذکر کرنا نہایت ضروری ہے کہ شاعر اصلی چیز ہیں اور فیشن کے اس دور میں اسی کی نقالی بھی ہوتی ہے۔ ادب کے انحطاط و زوال کے پرآشوب دور میں جب سے مشاعروں، محفلوں پر ''شاعر نما متشاعر نامی قوم'' نے مسلط ہو کر اقتدار حاصل کیا تو شاعروں جیسا حلیہ بھی اختیار کیا۔ خواہ ذلت و رسوائی کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اب ہر مشاعرے میں شرکت اور حادثات کو دعوت بھی دینے لگے۔ اگر لمبی زلفیں آمدنی کا سہارا ہیں تو کہیں باعث خسارہ بھی۔ جب شاعری کی دکان ہے تو نفع و نقصان بھی ہے۔

یہاں یہ بات واضح کر دیں کہ آج کل شاعروں کے طرز پر ناچ گانے اور نوٹنکی، ڈرامہ کرنے والے پیشہ ور بھی لمبے لمبے بال رکھتے ہیں۔ گویا انھوں نے شاعروں کا ''حق گیسو درازی'' غصب کر لیا ہے جو ایک زمانے تک شاعروں کے لیے مخصوص تھا، لیکن جب لمبے بال والے شعرا کی قلّت ہوگئی تو ان زنخوں اور ہیجڑوں نے ان پر قبضہ کر لیا۔ بعض قدیم شعرا تو اتنا ناراض ہیں کہ کہتے ہیں ہم کو عدالت عالیہ میں مقدمہ دائر کر اپنا حق بحال کرانا چاہیے تاکہ پھر دوبارہ کوئی اس پر قبضہ نہ کر سکے، مگر افسوس اس بات کا ہے کہ جدید شعرا ان کا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں ہیں۔ کیوں کہ وہ خود لمبے لمبے اور الجھے بالوں سے اتنا عاجز آ چکے ہیں کہ انھوں نے صاف کہہ دیا کہ بھئی ہم اپنے بال بچوں اور روٹی روزی کے مسئلے میں خود ہی اتنا الجھے ہیں کہ آپ لوگوں کے لمبے بالوں کے مسئلے سلجھانے کا وقت نہیں ہے۔ لہٰذا انھوں نے توبہ تو پہلے بول دی تھی اب معذرت بھی کر لی۔ ہاں کچھ شعرا اب بھی ہیں جو اپنا رعب و دبدبہ دکھانے کے لیے لمبے بال رکھتے ہیں کیونکہ ان کے اشعار کی کڑھائی میں کوئی ابال اور اچھال ہے ہی نہیں۔ بلکہ وہ سامعین کے لیے خود وبال ہیں۔ لہٰذا وہ لمبے بال ہی سے اپنی شاعری کا اقبال بلند کرنا چاہتے ہیں۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ ''دو لمبے بال والے متشاعروں'' کو ایک گاؤں میں مشاعرے میں شرکت کے لیے جانا تھا۔ جس گاؤں میں ان کو جانا تھا اس میں ہندو مسلم کی مشترک آبادی تھی۔ اتفاق سے اس رات گاؤں میں کسی ہندو مذہب والے کے یہاں شادی تھی اور جیسا کہ ان کے یہاں شادی کے موقع پر بینڈ باجہ کے ساتھ ناچنے گانے والے جسے عرف عام میں ہیجڑہ کہا جاتا ہے۔ ان سب چیزوں کا بھی اہتمام خاص طور سے ہوتا

ہے تو اس رات سب مہمان آ چکے تھے اور ناچنے گانے والے ہیجڑوں کا انتظار بڑی شدت سے ہو رہا تھا کہ وہ لوگ آئیں تو شادی کا پروگرام شروع ہو اور رات بھر ڈانس کا سلسلہ زور شور سے جاری ہو، لیکن وہ لوگ آئے نہیں ادھر ان کے یہاں بے چینی بڑھنے لگی اور شدت سے انتظار ہوتا رہا۔ کچھ لوگ آگے بڑھ بڑھ کر دیکھ رہے تھے کہ کہیں کوئی گاڑی تو نہیں آ رہی ہے جس پر وہ ناچنے والے ہوں، لیکن بہت دیر ہوگئی وہ لوگ نہیں آئے۔ ادھر ان کا انتظار بڑھتا گیا اور گاؤں کا پورا مجمع آگے بڑھ بڑھ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ کوئی گاڑی آتی تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے کہ ارے وہ آ گئے وہ آ گئے، لیکن مایوسی ہی ہاتھ لگتی۔ اچانک جن کی شامت آج تھی وہ نمودار ہونے والے تھے۔ یعنی جیسے جیسے شدت بڑھی ایک گاڑی رات کی تاریکی کو چیرتی ہوئی آگے بڑھی لوگ چلانے لگے کہ وہ آ گئے وہ آ گئے:

الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

جیسے ہی گاڑی رکی دو لوگ اندر سے نکلے۔ ''لمبے لمبے بال، جیسے نیم کے درخت کی چھال، چال بے مثال، ناواقف مستقبل وحال'' شادی والے آگے بڑھے۔ بولے تم لوگ کہاں تھے کیوں اتنی دیر کر دی۔ تم لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ چار ٹکے کے نوکر۔ کیا تم لوگوں کو ایڈوانس پیسہ نہیں دیا گیا تھا۔ ہم لوگ تمھارے نوکر ہیں۔ اتنی رات کو کب سے کھڑے کھڑے پورا گاؤں تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ تم لوگ اتنے وی آئی پی ہو گئے ہو۔ ہم لوگ اپنی کرسیاں چھوڑ چھوڑ کر کب سے تمھاری راہ تک رہے ہیں۔ تم دونوں کا وقت قیمتی ہے یا ہم لوگوں کا۔ تم لوگوں کو اور پیسہ چاہئے تھا تو بتانا تھا۔ دس ہزار، بیس ہزار کتنا چاہئے تھا۔ تم لوگ کتنے بڑے بزنس مین ہو۔

ان لمبے لمبے بال والے متشاعروں نے کہا بھئی ہم لوگ شاعر ہیں، کوی ہیں، ہم مشاعرہ پڑھنے کے لیے اس گاؤں میں آئے ہیں ہم وہ نہیں ہیں جن کا آپ انتظار کر رہے ہیں، لیکن وہ لوگ نہ مانے۔ اب ان لوگوں نے قسمیں کھانا شروع کیں۔ بہت منت سماجت کی، بہر حال تب ان لوگوں نے چھوڑا۔ اب یہ لوگ آگے بڑھے اور گاؤں کے دوسرے چھور پر مشاعرہ کے اسٹیج پر پہنچے اور کسی سے یہاں تک کہ صاحب مشاعرہ سے بھی کچھ نہیں بتایا کہ بے عزتی ہوگئی۔ بہر حال یہ لوگ یکے بعد دیگرے اپنا کلام سنانے لگے اور اپنے لمبے بالوں کو جھٹک جھٹک کر مخصوص انداز میں اشعار پڑھنے لگے۔ کبھی اپنے ہاتھوں سے بالوں کو سہلاتے، سنوارتے جیسا کہ ان کا دستور ہے کہ عوام کو اپنے اشعار سے کم اور اسٹائل سے زیادہ متوجہ کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا ستارہ گردش میں تھا کہ اس مشاعرے میں کچھ لوگ اس شادی سے آ کر یہ منظر دیکھ رہے تھے جیسا کہ ہندوستانی مشترکہ تہذیب کی علامت ہے، لیکن ان کا انداز ہی ایسا تھا کہ سب کو اسٹائل سے اپنی جانب کھینچے ہوئے تھے اور یہ سب عجیب وغریب منظر غیر مسلم برادری والے بھی دیکھ رہے تھے اور آپس میں کہہ رہے تھے کہ یہ وہی لوگ ہیں ہمارے ناچنے والے جو بھولے سے یہاں آ گئے ہیں یا یہاں زیادہ پیسہ کے لالچ میں آ گئے ہیں۔

اور ادھر رقص کرنے والے رات بھر نہیں آئے۔ بہر حال مشاعرہ ختم ہوا۔ اب لمبے بال والے متشاعر اپنا نذرانہ لے کر واپس ہونے لگے۔ اب راستے میں پھر وہی لوگ مل گئے اور روک کر بولے تم لوگ جھوٹ بول رہے تھے۔ ہماری شادی کا منظر چوپٹ کر دیا، تم لوگ زیادہ پیسہ کے لالچ میں بک گئے۔ ہم نے دیکھا رات بھر خوب ڈانس کیا اور تمھارے ڈانس پر پوری جنتا اچھل رہی تھی اور لوگ ہنس ہنس کر مزے لوٹ رہے تھے۔ اب انھوں نے بہت دلیلیں دیں کہ ہم لوگ وہ نہیں ہیں، لیکن وہ نہ مانے اور پھر ان کی لاتوں، گھونسوں سے پٹائی شروع کر دی، جیسا کہ مشاعروں میں چلنا اور پٹنا یعنی کامیاب ہونا اور فلاپ ہونا ہمارے شعرا کا روز کا معمول ہے، لیکن عوام کے ذریعے عملی طور پر پٹ کر کسی مشاعرے سے آنا پہلی بار ان لوگوں نے دیکھا تھا۔ اب جب کسی طریقے سے وہاں سے نجات ملی تو گاڑی میں بیٹھ کر واپس ہونے لگے تو غالب کا یہ مصرع زبان پر تھا:

بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

زلفوں پر تاریخ ادب میں بے شمار واقعات درج ہیں۔ شاعر سماج کے مثالی ہیں تو ان کی نقالی پر آئے دن حادثات بھی ہوتے رہتے ہیں ہمیں اس بحث میں نہیں پڑنا ہے۔

بہر حال جب عوام کو ان سے محبت ہے تو ہمیں بھی اپنے قبیلے سے ہمدردی ہے۔ ہمیں ان کی لمبی زلفوں سے اتنا عشق ہے کہ بے ساختہ ان کے موئے مبارک کے بوسے لینے کو جی چاہتا ہے اور دل سے یہی دعا نکلتی ہے کہ ''تمہارا بال سلامت، تمہاری زلف دراز''۔

کہیں زلف طویل کی طرح مضمون بھی طویل نہ ہو جائے، لیکن آخر میں اتنا تو کہہ سکتے ہیں کہ امیر، غریب، شاعر، ادیب، واعظ، خطیب، صوفی، فقیر، حکیم، طبیب، شاہ، وزیر، ملّا، پنڈت، مصور، مفکر، محقق، مہندس وغیرہ سبھی قوموں کے سر ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں کی طرح زلف پوش ہیں۔ اس کی عظمت کے لیے یوں ہی نہیں کہا گیا ہے:

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
سب تری زلف کے اسیر ہوئے

◆◆◆